اسلام کا اقتصادی نظام:

اسلام کا معاشی نظام

پروفیسر اطہر رضا بلگرامی
جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

سماجی علوم میں اقتصادیات نے حیات انسانی کی مادی ضروریات کا احاطہ کیا ہے اور مادی آسودگیوں کے حصول کے متعلق قانون مرتب کیے ہیں۔ اس طرح اقتصادیات یا معاشیات کی فکر وفلسفہ اور اس کا زاویہ نگاہ زندگی کی مادی ضروریات، آرائیشوں و زیبائیشوں پر مرکوز ہے جہاں ان کی تکمیل کی حد انتہا کو مقصد حیات تسلیم کیا گیا ہے۔ انسان کی مادی خواہشات فطری ہیں جن سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ یہ بھی صحیح ہے کہ حیات انسانی انہیں مادی خواہشات کی تکمیل پر ٹکی ہے۔ ایک انسان کی حیات بغیر غذا پانی اور ہوا کے ممکن نہیں۔ انسان ایک سماجی رکن ہے اس لئے سماج کے تقاضوں کی تکمیل کے لئے گھر مکان ملبوسات اسی قدر ضروری ہیں جس قدر غذا۔ زندگی کو کون آرام دینا نہیں چاہتا۔ موسمی تبدیلیوں کے تحت گرم وسرد موسم کی مناسبت سے ملبوسات کی نوعیتوں میں کون تبدیلی لانا نہیں چاہتا۔ گرمی میں ٹھنڈی ہوا اور جاڑوں میں گرم ہواسکون وآرام کا احساس دیتی ہے اسلئے اگر انسان اس خواہش کی تکمیل کا اہتمام کرتا ہے تو یہ بھی ایک فطری خواہش اور فطری عمل کہلائے گا۔

معاشیات نے مادی نظام حیات کے دائرے میں انسان کو متعارف کرایا۔ معاشیات کے تحت ایک انسان لامتناعی مادی خواہشات کا پیکر ہے جس کا سلسلہ زندگی کی پہلی سانس سے آخری سانس تک کبھی نہیں ٹوٹتا۔ یہاں تک کہ دنیا سے رخصت ہوکر بھی مختلف رسوم کی ادائیگی کی شکل میں جاری ہی رہتا ہے۔ یقیناً انسان کی مادی خواہشات لامحدود ہیں جبکہ ان کی تسکین وتکمیل کے ذرائع محدود ہوا کرتے ہیں اس لئے انسانی سماج میں ایک جہد پیہم کا سلسلہ روز

آفرینش سے جاری وساری ہے جہاں محدود ذرائع کے ذریعہ زیادہ سے زیادہ خواہشات کی تکمیل کی سعی وجستجو ملتی ہے نظام پیداوار، تقسیم، تجارت، سائنس وٹکنالوجی کے نت نئے انکشافات دولت وسرمایہ کی گردش، نظام قیمت جس گوشے پر نظر ڈالیے ان کے جن اصولوں اورفکری سطحوں کی تعبیر کیجئے ان کا محور اسی جہد پیہم پر ٹکا نظر آتا ہے۔

دنیا کا معاشی نظام حیات مادی عناصر کے تانے بانے سے حیات انسانی کو سجانے سنوارنے کا احاطہ کرتا ہے۔ مادی عناصر سے ہٹکر انسان کے کردار، اخلاق، نیک وبد اعمال، قناعت، صبر، حق گوئی جیسے غیر مادی عوامل کو نہ کوئی اہمیت دی گئی اور نہ ان کو جزو نظام بنا کر کامیابیوں وناکامیابیوں کو پرکھنے کی کسوٹی تسلیم کیا گیا۔ یوں تو عدل وانصاف، مساوات، فلاح وبہبود، امداد ورعایت کے بہت سے نظریات معاشیات کے نظاموں میں مل جائیں گے۔ لیکن وہ آفاقی نظریات سے زیادہ محض ایک مخصوص زاویہ فکر کی تبلیغ کے آلہ کار کے سوا کچھ نظر نہیں آتے۔ سرمایہ دارانہ نظام میں بھی مساوات وفلاح کا تصور موجود ہے اور اشتراکی نظام میں بھی اس کا وجود ملتا ہے لیکن دونوں کے آلہ کار جدا جدا اور ان نظاموں کی تبلیغ کا محض ایک ذریعہ ہیں۔ یہ دونوں نظام حیات جو دنیا کے ذہنوں پر چھائے ہوئے ہیں اپنے وضع کرنے والوں کی فکری استعداد کے ترجمان ہیں۔ اسلام کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ وہ ان دونوں طرز معاشرت کی مشترک مثبت خصوصیات سے ہٹ کر کوئی الگ اور منفرد نظام حیات پیش نہیں کرتا۔ لیکن اگر تعلیمات اسلامی میں چند ایسی منفرد خصوصیات کی نشان دہی کی جائے جو دنیا کے مروجہ نظاموں میں مفقود ہیں تو پھر دنیاوی نظام حیات کی کجی اور اسلامی نظام کے کامل صالح اور منفرد ہونے کو تسلیم کرنا پڑے گا اور پھر یہ بھی ماننا پڑے گا کہ اسلام میں معاشی انسان کا تصور کس قدر مکمل صالح اور مستحکم ہے۔

دنیا کے مروجہ نظام حیات اور اسلام کے نظام حیات کے درمیان بنیادی فرق یہ ہے کہ اسلامی نظام کسی انسان کی فکر ونظر کا ترجمان نہیں ہے اور نہ اس کی تشکیل میں کسی انسان

کے عملی یا اجتماعی تجربات کا دخل ہے۔ اسلام دینِ فطرت و دین کامل ہے اس لئے یہ ایک ایسے انسانی معاشرے کو پیش کرتا ہے جو فطرت سے ہم آہنگ ہو اور ایسا آفاقی ہو جو ہر بدلتے دور میں مشعلِ راہ بنے۔ دنیاوی نظام انسان کی خود ساختہ فکر کا نتیجہ ہے اس لئے محض دنیوی زندگی اور مادی عناصر کے احاطے میں انسانی حیات کی تنظیم پیش کرتا ہے۔ ذرا غور کیجئے دنیا میں انسان کتنے دن زندہ رہتا ہے۔ وہ کتنے سال ایسے جیتا ہے کہ دنیا اس کی قدر کرے، اس کی ضرورت محسوس کرے پھر کروڑوں انسانوں کے درمیان کتنوں کے لئے ایسے سوالات اہمیت کا باعث اور توجہ کے حامل ہیں۔ اگر اوسطاً انسان ۶۰ یا ۷۰ سال بھی جیا تو گویا ان دنیوی نظاموں کا تعلق اس کی زندگی کے بس اس قلیل سفر تک محدود ہے۔

اسلام اس قلیل مدت حیات کے بعد ایک دائمی حیات کا تصور بھی پیش کرتا ہے جس کو مائل بہ فنا مادی حیات سے اس طرح جوڑتا ہے کہ دنیا کی مختصر و عارضی زندگی حیات ابدی کا پیش خیمہ بن جائے۔ اس کا نظریہ یہ ہے کہ انسان دنیا کی مختصر زندگی میں اپنی تمام جدوجہد و صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے جو بھی مال و دولت عیش و عشرت کے ساز و سامان اکٹھا کرتا ہے وہ ان سے اپنی زندگی تک مستفید ہونے کا اہل ہے۔ اگر اقتصادیات اس حقیقت کو پیش کرتی ہے کہ انسان مادی خواہشات کا پلندہ ہے جس کا سلسلہ آخری سانس تک چلتا رہتا ہے تو اسلام بھی ایک دوسری حقیقت کو پیش کرتا ہے کہ دنیا میں انسان خالی ہاتھ آیا ہے اور یہاں سے خالی ہاتھ ہی جائے گا۔ وہ اپنی زندگی کی تمام جدوجہد کے ثمر اپنے ساتھ لے جانے کا اہل نہیں خواہ شاہ ہو یا گدا۔ ہاں اگر اس مادی دنیا سے کوئی شئے اس کے ساتھ جاتی ہے تو وہ شئے ایسی ہے جس کو موجودہ مادی دنیا کا اقتصادی نظام کامیابی و ناکامی کو پرکھنے کی کسوٹی نہیں بناتا اور وہ شئے ہے اس کے نیک و صالح اعمال۔

پس اسلام کی نگاہ میں انسان کے اعمال اتنے عظیم ہیں جو قلیل العمر مادی و طویل العمر روحانی دنیا میں ربط قائم کیے ہوئے ہیں۔ جو شخص نیک و صالح اعمال، بلند کردار، اچھے اخلاق

کے ساتھ دنیا سے رخصت ہوگا اس کے لئے دنیا کی قلیل عمر بھی طویل ہوجائے گی۔ وہ دنیا کی تاریخ کا ایک درخشاں باب بن کر زندہ رہے گا اور تا قیامت دنیا کے لئے مشعل راہ بنا رہے گا۔ وہ اپنے ان اعمال کی بدولت دوسری دنیا کی دائمی زندگی کو پرسکون بنالے گا۔ اس کے برعکس بداعمال و پست کردار والوں کے لئے دنیا تو تنگ ہے ہی مرنے کے بعد وہ باقیات برائی کی علامت بنا کر یاد کیا جاتا رہے گا۔ بداعمالیوں سے وابستہ افراد دنیا میں زندہ رہ کر بھی عزت واحترام کھودیتے ہیں اور مرکر دوسری دنیا میں اپنی بد اعمالیوں کی سزا جھیلتے ہیں۔ اس طرح اسلام نے حیات انسانی کو جو وسعت و جامعیت دی ہے اس کا دنیا میں موجود کسی اقتصادی نظام میں کوئی تصور بھی ممکن نہیں ہے۔

اسلام حیات انسانی کی وسیع، عمیق اور جامع تصویر پیش کرتا ہے۔ وہ ایک ایسا انسان پیش کرتا ہے جو محض مادی خواہشات کے لامتناہی جال میں پھنس کر عارضی دنیا کا نہیں بلکہ اس دنیا کا رکن بھی ہے جہاں مادیت کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ وہ ایک ایسا معاشرہ پیش کرتا ہے جو دین ودنیا دونوں کو سمیٹے ہوئے ہے اور اس کو ایسے قوانین فطرت سے باندھتا ہے جو نہ انسان پر بوجھ بنے کہ کٹھن حالات میں ان کو اتار پھینکنے کی آرزو ابھرے اور نہ ایسا مصنوعی کہ عمل کے میدان میں یقین وعمل ڈگمگاتے نظر آئیں۔ وہ اس کو سجانے، سنوارنے اور نکھارنے میں مائل بہ فنا مادی وسائل کے ہمراہ، اخلاق، کردار، عمل صالح، صبر وضبط، قناعت، حق وصداقت میانہ روی جیسے لافانی عوامل کو خوبصورتی سے مربوط کررہا ہے ان کو کامیابی وناکامی کی کسوٹی قرار دے رہا ہے اور مادی واخلاقی عوامل کے ایک ایسے توازن کو قائم رکھنے کی ہدایت کررہا ہے جس کے سہارے انسان حیات جاودانی حاصل کرسکتا ہے۔

ہر انسان میں دو فطری اور بنیادی کمزوریاں ہیں جن کو دنیا کے مروجہ معاشی نظاموں نے اپنی فکر کا محور قرار دیا اور اسلامی نظام نے ان کے لئے لامتناعی رویہ اختیار کیا۔ اول انسان لامتناعی خواہشات وتمناؤں کا پلندہ ہے اور وہ خواہشات ایسی ہیں کہ بقول غالب ہر خواہش پہ

انسان کا دم نکلتا ہے اور سارے ارمان نکل جانے پر بھی یہی احساس رہتا ہے کہ بہت کم نکلے۔ چونکہ اس کی ہر خواہش اور ہر تمنا پوری نہیں ہوتی جس کی وجہ سے وہ طمع، حرص، توہم پرستی، حسد، جلن، نفرت جیسے منفی رجحانات کا شکار بنتا ہے۔ دوم انسان فطرتاً خود غرض بھی ہے جس کی بدولت ذخیرہ اندوزی، جمع خوری، منافہ پسندی جیسے رجحانات کی طرف مائل ہوتا ہے اور غیر منصفانہ نظام تقسیم کو رائج رکھنے میں سکون محسوس کرتا ہے۔ حیات انسانی کے یہ دو ایسے مستحکم و مضبوط عوامل ہیں جن کو تعلیم و تربیت، ماحول ترغیب اور دیگر قوانین کے ذریعہ نظم وضبط و شائستگی تو دی جاسکتی ہے بدلا یا مٹایا نہیں جاسکتا ہے۔

دنیوی معاشی نظاموں کی پرشکوہ عمارت خواہ وہ سرمایہ دارانہ نظام کی ہو یا اشتراکی نظام کی، انسانی معاشرہ کی انہیں دو کمزوریوں پر ٹکی نظر آتی ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام ان لامتناعی خواہشات کو زیادہ سے زیادہ ہوا دیتا نظر آتا ہے کیونکہ ان کے مسلسل پھیلاؤ میں ہی اس نظام کا استحکام مضمر ہے۔ انسان کی خودغرضی کا جذبہ بھی اس نظام میں خوب پنپتا ہے۔ اس نظام کی بے لگام آزادی انسان کو حسب استعداد دولت و ثروت سمیٹنے پر مجبور کرتی ہے۔ اور معاشرہ کو عدم مساوات و استحصال کے کبھی نہ ٹوٹنے والے دائرہ میں جکڑ لیتی ہے۔ اس کے ردعمل کے بطور عدم استحصال و عدم مساوات کے نام پر اشتراکی معاشی نظام انسان کی فطری خواہشات کو دبا تا و کچلتا نظر آتا ہے۔ وہ انسان کی آزادی کو ہی سلب کرنے کے حق میں ہے تاکہ اس کی خود غرضیوں پر پابندی لگائی جاسکے اور خواہشات کو قید کیا جاسکے جن کی آزادی کی بدولت معاشرہ استحصال و عدم مساوات کا شکار ہوتا ہے۔ دونوں ہی نظاموں میں شدت و انتہا پسندی پائی جارہی ہے جس کا لازمی نتیجہ بے راہ روی، بد اخلاقی، بد امنی، گھٹن اور انتشار کی صورت میں ہمارے سامنے ہے۔

اسلام دونوں انتہا پسند رجحانات کی نفی کرتا ہے۔ وہ جس قدر فرد کی بے لگام آزادی کے نتیجہ میں خواہشات کے بے تحاشہ پھیلاؤ کا مخالف ہے، اسی قدر خواہشات کے فطری ہونے

کا احترام کرتے ہوئے اس نظریہ کی مخالفت کرتا ہے جو ان کو کچلنے دبانے اور غیر فطری طور پر قید وبند میں مقید کرنے کو حق بجانب سمجھتا ہے تا کہ دنیا کے سامنے استحصال سے پاک، کامل مساوات پر مبنی معاشرہ کا نمونہ پیش کیا جا سکے خواہ تاریخی اعتبار سے وہ کتنا ہی کھوکھلا، مصنوعی، عارضی کیوں نہ ثابت ہوا ہو۔ اسلام میانہ روی اور متوازن راستہ کا ترجمان ہے تا کہ معاشرہ کو انتہا وشدت پسندی کے منفی نتائج سے محفوظ رکھا جا سکے۔ اسلام معاشرہ کے لئے صراط مستقیم کی نشان دہی کر رہا ہے جہاں انسان کی آزادی سلامت رہے لیکن نظم وضبط کے ساتھ اور خواہشات کا احترام قائم رہے لیکن دوسروں کی خواہشات کے احترام کے ساتھ۔

سرمایہ دار معاشی نظام کی عمارت، کامل آزادی، انفرادی ملکیت اور ثروت وسرمایہ کی سطح پر ٹکی ہے۔ اس معاشی نظام نے فرد کے جذبہ آزادی کا احترام کرتے ہوئے اس کو مکمل آزادی دے دی۔ اس کی فکر یہ بتلاتی ہے کہ انسان فطری طور پر آزاد پیدا ہوا ہے تو پھر اجتماعی طور پر بھی اس کو آزاد رہنا چاہئے۔ حکومت کو اس آزادی میں نہ مداخلت کرنی چاہئے اور نہ اس راہ میں سد راہ ہونے کا حق ہونا چاہئے۔ سماج کے ہر فرد کو حسب خواہش کام کرنے، تجارت وکاروبار کرنے اور روزی کمانے کی سعی وجستجو کی آزادی ہے جہاں وہ اپنی پیدا کی ہوئی دولت سے خود ہی مستفید ہوتا ہے اور چونکہ وہ خود مستفید ہوتا ہے اس لئے اپنے کاروبار کو زیادہ سے زیادہ فروغ دینے کی جدوجہد میں مصروف بھی رہتا ہے چونکہ کئی کاروبار کے پھیلاؤ کے ساتھ سماج کے دوسرے افراد کا منسلک ہونا اور ان کی روزی روٹی کا ذریعہ نکل آنا ناگزیر بن جاتا ہے اس لئے یہ نظریہ تبلیغ کرتا ہے کہ فرد کی آزادی سے پورا معاشرہ خوشحالی وترقی کی طرف بڑھتا ہے گویا اس کی فکر یہ تعلیم دے رہی ہے کہ ''انفرادی آزادی'' اجتماعی خوشحالی کا وسیلہ ہے۔

فرد کی آزادی، اس کے کاروبار وروزگار کا انتخاب، اس کی کوشش وسعی اور اس سے مستفید ہونے میں کوئی برائی نظر نہیں آتی۔ لیکن یہاں ایک اہم نکتہ کو قطعی نظر انداز کر دیا گیا اور وہ یہ کہ انسان انفرادی طور پر تو یقیناً آزاد پیدا ہوا ہے لیکن اجتماعی طور پر نہیں۔ اجتماعی

معاملات میں ہر شخص کو دوسرے کے حقوق کا لحاظ رکھنا ہوگا تا کہ دوسروں کے ذریعہ اس کے حقوق کا بھی تحفظ ہوسکے۔ اس طرح گویا ہر فرد پہ دوسرے کی زندگی کی ذمہ داری بھی عائد ہے۔ سرمایہ داری طرز فکر میں آزادی کا جو تصور ہے اس سے مادی نشاط و ذرائع پیداوار کی وسعت تو ممکن ہے لیکن اس کو عوام تک پہونچانے کی ضمانت نہیں ملتی۔ چونکہ اس نظام میں انسان کھلی وآزاد فضا میں زندگی گزارتا ہے اس لئے اپنی لامتناعی خواہشات کی تسکین کے لئے اس کو ہمہ وقت دوسروں کے مقابلے اپنی صلاحیتوں کو بہتر بناتے رہنے کی فکر رہتی ہے۔ جب ہر فرد کی فکر کا محور یہی ہوگا تو گویا پورا معاشرہ مقابلہ کے ماحول میں بہتر سے افضل اور افضل سے اعلیٰ کو پالینے کی جہد مسلسل میں ڈوبا نظر آئے گا اور اس کے آگے وہ کچھ نہیں سوچے گا۔

اس جہد مسلسل میں چھپی کمزوریوں سے چشم پوشی کرلی گئی ہے۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ معاشرہ کے افراد اعضاء وجوارح، جذبات واحساسات، طبیعت ومزاج اور ذہنی سطح کے اعتبار سے مساوی نہیں ہوتے۔ ان میں چاق وچوبند، سست وکاہل، مہم جو، محتاط، ضعیف ولاغر، عقل مند وکند ذہن سب ہی ہوتے ہیں۔ نتیجتاً سب کی صلاحیتیں تو برابر نہیں ہوسکتیں، لیکن خواہشات وتمناؤں اور خودغرضی کا جذبہ ہر فرد میں موجود ہوتا ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام کی آزادی معاشرہ کو مقابلہ کی اندھا دھند دوڑ میں گھسیٹ لے جاتا ہے جہاں صلاحیتوں کی تفریق، طبیعت وطینت کے امتیازات اور رجحانات وترغیبات کے اتار چڑھاؤ کے مطابق بٹے ہوئے انسانی گروہ، دولت وثروت کے ساز وسامان کو اپنی اپنی استعداد کے بموجب سمیٹنے میں لگ جاتے ہیں جس کو آزاد معاشرہ کا نقیب سرمایہ دارانہ نظام فطری نظام کے لقب سے سرفراز کرتا ہے۔ بغیر یہ خیال کئے ہوئے کہ اس کا فطری نظام جائز وناجائز کے فرق کو مٹانے، تمام اخلاقی قدروں کو پامال کرنے اور کنبہ وخاندان اور ہمسائے کے درمیان تمام اخلاقی رشتوں اور حقوق وفرائض کو روندنے اور معاشرے کو استحصال اور طبقات میں تقسیم ہوتے رہنے کے لئے چھوڑ رہا ہے۔

ایسے ماحول میں دولت مند اور بااقتدار افراد میں بیدردی اور شقاوت کی روش کا ابھرنا فطری ہے جس کا نتیجہ اخلاقی پستیوں کی شکل میں سامنے آتا ہے۔ وہ اپنے سے کم تر طبقہ کو حقیر وذلیل اور اپنے کو صاحب عزت واحترام سمجھتا ہے۔ وہ اپنے ہم عصروں کو اپنے مد مقابل ہوتے ہوئے پیچھے دھکیلنے کا کوئی حربہ ہاتھ سے جانے نہیں دیتا۔ بزرگ والدین کی خدمت واطاعت کو تضیع اوقات سمجھتا ہے کیونکہ وہ اب اس سسٹم کے کارآمد پرزے نہیں رہے جس پر وقت وسرمایہ لگایا جائے۔ بچوں کی سرپرستی ونگہہ داشت کو بھی وقت کی بربادی سمجھتا ہے اور اس کے لئے خصوصی ماہرین یا اداروں کا سہارا لیکر اس فرض کی ادائیگی سے مطمئن ہوجاتا ہے۔ ایسے نظام کا انسان ذہنی ومزاج کے اعتبار سے اس قدر پستی کا شکار ہوجاتا ہے کہ لاچاری وغربت میں سود پر لیے ادھار روپیہ کو ساہوکار کی اعلیٰ انسانی خدمت قرار دیتا ہے۔ اس کی ناآسودہ زندگی خودداری کا گلا گھونٹ کر احسان مندی کے بوجھ تلے دب جاتی ہے۔ وہ ساہوکار کو عزت کی نگاہ سے دیکھتا ہے کہ وہ میرے برے وقت کام آیا اور صحیح وقت پر ادھار لی گئی رقم کو واپس کردینے پر ساہوکار کی طرف سے سود کے چند روپیہ معاف کردینے کو عظیم کارخیر سمجھنے لگتا ہے۔ اس نظام کی اخلاقی پستی کا یہ عالم ہے کہ اگر سود کی رقم واپس نہ کرے تو گویا وہ سماج کا سب سے بڑا مجرم ہے لیکن سود کی رقم کھا کر غریب کا تاحیات استحصال کرتے رہنا، اس کی کاوش، محنت کو ناقدری کی نگاہ سے دیکھنا، لاچار وبے بس انسان کو معاشرہ کا بےکار وفضول حصہ سمجھنا کوئی جرم نہیں۔ یہ سارے عیوب بے روک ٹوک آزادی کا لازمی نتیجہ ہیں جس کی اسلام مخالفت کرتا ہے۔

جان لیوا مقابلے، استحصال، حق تلفی اور غیر عادلانہ رویہ کو جھیلتے جھیلتے جب معاشرہ شدید انتشار وبدامنی کا شکار ہوا تو بطور ردعمل اشتراکی نظام کی آغوش میں پناہ ڈھونڈنے آیا، جس کی بنیاد مساوات پر قائم کی گئی تھی۔ اس نظام کے زیرسایہ انسانیت کو جس جنت کا خواب دکھلایا گیا وہ بھی شرمندہ تعبیر نہ ہوسکا اور مشکل سے ۴۰ یا ۵۰ برس کی قلیل عمر پاکر خود اپنے

اصولوں کا کفن پہن کر موت سے ہم کنار ہوگیا۔

اشتراکی نظام، سرمایہ دارانہ نظام کا انتقامی عکس تھا، اس کی ضد تھا اور ظاہر ہے جو نظام انتقام وضد پر کھڑا ہو وہ انسانی معاشرہ کو نام نہاد انقلابی وانتقامی فکر کے سوا کچھ نہیں دے سکتا۔ وہ استحصال، عدم انصاف کے خلاف ہمیشہ نبرد آزما نظر آئے گا جہاں اس کی فکر سرمایہ داری کے خلاف رہ کر ہی پنپے گی۔

اشتراکی نظام میں سرمایہ داری کے تمام عیوب کی جڑ انسان کی بے لگام آزادی کو قرار دیا گیا کیوں کہ اسی آزادی نے انفرادی ملکیت کو جنم دیا ہے جو تمام استحصال کی جڑ ہے۔ ملکیت کی بنیاد قیمت ہے جو بہ اعتبار انسانی محنت کی سطح کے، طے ہوتی ہے جس شے پر جتنی انسانی محنت صرف ہوگی وہ اسی قدر قیمتی ہے چونکہ کسی شے کو قیمتی بنانے والا عنصر انسانی محنت ہے اس لئے اس نظام نے حقیقی ملکیت کا حق محنت کش کو دیا، مالک سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ محنت اور قیمت کے متبادل رشتہ کو یوں قائم کیا کہ اگر کوئی انسان ۸ گھنٹہ یومیہ ۳ ماہ تک محنت کر کے ۲۰ کوئنٹل گندم پیدا کرتا ہے تو بہ اعتبار محنت گندم کی یہ مقدار ۲۰ × ۷ گھنٹہ محنت کا نتیجہ ہے۔ اب اگر دوسرا شخص اسی قدر وقت اور محنت سے ۲۰ میٹر کپڑا تیار کرتا ہے تو وہ بھی ۲۰ × ۷ گھنٹہ محنت کا نتیجہ ہوگا۔ اس طرح بہ اعتبار محنت دونوں اشیاء کی قیمت مساوی ہوگی۔

اشتراکی نظام نے اشیاء کی قیمت طے کرنے میں صرف محنت کی مقدار کو اہمیت دی اور دیگر عناصر آبادی کی رفتار، پیداوار کی کمی یا زیادتی یعنی پیداوار کی سطح، ٹکنالوجی، معاشرتی واجتماعی عناصر اور افراد کے نفسیاتی پہلوؤں کو مطلق نظر انداز کردیا حالانکہ ان عناصر میں ہونے والی تبدیلیاں قیمتوں میں اتار چڑھاؤ کا باعث بنتی ہیں۔

پھر ایک اہم نکتہ کی طرف کوئی توجہ نہیں دی گئی۔ ہر انسان جانتا ہے کہ اس کی زندگی کے وجود کے لئے پانی ونمک کس قدر اہم ہیں۔ انسان ہیرے، جواہرات، سونا و دیگر عیش وعشرت کے سازوسامان کے بغیر تو جی سکتا ہے لیکن پانی ونمک کے بغیر نہیں پھر بھی ان اہم

اشیاء کی وہ قدر قیمت نہیں جو سونے ، ہیرے جواہرات یا دیگر عیش وآرام کی اشیاء کی ہے۔ آخر کیوں؟ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اشیاء کی قیمت طے کرنے میں صرف محنت ومشقت ہی نہیں ، مقدار وندرت کو بھی دخل ہے۔ طلب کے مقابلہ میں جس شئے کی مقدار جتنی کم اور جتنی نادر ہوگی اس کی قیمت اسی قدر زیادہ ہوگی۔ لب دریا پانی بے وقعت اور بے آب وگیاہ صحرا میں ہونے سے زیادہ قیمتی بن جاتا ہے۔ یوں تو ہوا (آکسیجن) کی کوئی قدروقیمت نہیں لیکن جب اس ہوا کو غوطہ خوروں ، کان کنی کرنے والوں اور ہسپتالوں میں مریضوں کی پشت پر سلنڈر کی شکل میں محصور کرکے زندگی کی ضمانت بنادیا جاتا ہے تو اس کی قدروقیمت کا احساس ہوتا ہے۔ اگر ایک مزدور مسلسل تین ماہ تک ۸ گھنٹہ کان کی کھدائی کرتا ہے اور پانچ ہیرے دستیاب کرتا ہے اور دوسرا مزدور اتنی مدت اور اسی قدر محنت کرکے ۲۰ کوئنٹل گندم دستیاب کرتا ہے تو کیا دنیا کا کوئی انسان ان دونوں کے باہمی تبادلے پر تیار ہوگا اور کیا انصاف کے بازار میں یہ دلیل پیش کی جاسکتی ہے کہ دونوں اشیاء پر صرف کی جانے والی محنت یکساں ہے اس لئے دونوں کی قیمت بھی برابر ہوگی۔

اشتراکی نظام نے اپنے قانون کی وضاحت میں ان تمام عناصر کو نظر انداز کردیا۔ اس نے تو محض سماج کے ایک بڑے طبقہ کا استحصال دیکھا ہے اور صدائے احتجاج بلند کی لیکن اس احتجاج میں فلسفیانہ سنجیدگی سے زیادہ انتقامی بھڑک غالب نظر آئی ہے جہاں سرمایہ دار طبقہ کو ظالم ثابت کیا جائے اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب محنت کو دلیل بنا کر سرمایہ دار کو محنت کے دائرہ سے نکال دیا جائے ۔ یہ اس نظام کی بنیادی کمزوری اور تنگ نظری ہے۔ اگر دیکھا جائے تو سرمایہ دار ذہنی کاوش کرنے والا اور جوکھم اٹھانے والا، مصائب برداشت کرنے والا طبقہ ہوتا ہے جس کی بدولت پیداواری سرگرمیاں آگے بڑھتی ہیں اور ان میں مسلسل اضافہ ہوتا ہے۔

اس نظام نے معاشرہ کی تمام برائیوں کی جڑ آزادی اور ذاتی ملکیت کو قرار دیا اور

اس کے خلاف جذبہ انتقام سے مغلوب ہوکر ''انفرادی ملکیت'' کو اجتماعی ملکیت میں بدل دیا۔ وہ ملک کی ساری دولت سرمایہ وسائل وخدمات کو عوام کا اور عوام کو ملک کا خادم قرار دیتا ہے۔ ہر شخص کا فرض ہے کہ وہ بقدر طاقت واستعداد اور رجحان وصلاحیت محنت کرے اور بقدر ضرورت اس کا ثمر حاصل کرے۔ اس کی ضرورت کا تعین وہ خود نہیں بلکہ حکومت کرے گی۔ یعنی اشتراکی نظام کا معاشی انسان پیدا ہو تو جماعت کے لئے محنت کرے تو جماعت کیلئے، کاوش وجستجو میں لگے تو جماعت کے لئے جئے تو جماعت کیلئے اور مرے تو جماعت کیلئے اس لئے وہ پیدائش سے ہی حکومت کا غلام اور اپنے دست وبازو کی طاقت کو اسٹیٹ کا صدقہ سمجھتا ہے۔

اس کو اس بات پر تعجب نہیں ہوتا کہ میرے دست وبازو کی پیدا کی ہوئی اشیاء وخدمات پر اسٹیٹ کا قبضہ کیوں ہے اور میری کمائی ہوئی دولت پر تصرف کا اختیار اسے کیوں نہیں ہے؟ اس نظام نے اس حقیقت سے چشم پوشی کرلی کہ افراد جسمانی وذہنی استعداد طبیعت ومزاج رجحانات وترغیبات کے اعتبار سے مساوی نہیں ہوتے۔ اس لئے اب اگر حکومت محنت کے بموجب صلہ دینے پر اتر آئے تو وہ طبقہ جس نے ان عناصر کے تحت زیادہ محنت کی ہے وہ اور جن لوگوں نے کم محنت کی ہے دونوں حکومت کی طرف سے مساوی اجرت کے حقدار ہوں گے۔ ایک طبقہ یا اس کے کچھ افراد دوسروں سے زیادہ پیدا کرنے اور کمانے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور وہ اس کے بموجب حق پانے کے حقدار بھی ہیں لیکن مساوات کے اصول نے ان کے اس حق کی حق تلفی کی ہے۔ یہ مصنوعی اور جبری مساوات معاشرہ کو تقسیم ہونے سے نہیں بچا سکتی ہے۔

اس غیر فطری جبری مساوات نے اس حقیقت سے بھی منہ موڑ لیا کہ انسان کا فطری جذبہ ''آزادی'' ہے جس کو ''حب نفس'' کہا جاسکتا ہے۔ اس جذبہ کا احترام نہ کرکے اس نظام نے فاش غلطی کی۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ انسان کے جملہ اعمال وافعال کا سرچشمہ اپنے نفس سے محبت ہے جس کو وہ پابند دیکھنا پسند نہیں کرتا۔ ایک نوزائیدہ بچہ جس کے پاس اظہار خیال کے لئے ابھی زبان بھی نہیں وہ بھی رو کر، ہمک کر، مسکرا کر، ہاتھوں اور پیروں کو حرکت

دے کر لوگوں کی توجہ اپنی طرف موڑنے کی کوشش کیوں کرتا ہے۔ انسان کو مرض سے نفرت وصحت سے رغبت کیوں ہے؟ دولت کیوں جمع کرتا ہے؟ اقتدار کے پیچھے کیوں بھاگتا ہے؟ ممالک پر حملہ کیوں کرتا ہے؟ ان سب کا جواب یہی ہے کہ وہ اپنی ذات سے محبت کرتا ہے۔ اشتراکی نظام نے اس حب ذات کو حب جماعت میں ضم کرنے کی کوشش کی اور اس کے لئے جوراستے اپنائے وہ تعلیم وتربیت اورقہر وغلبہ تھا۔تعلیم وتربیت اور جبر کے ذریعہ یہ فکر پیدا کرنے کی کوشش کی گئی کہ اس کا ذاتی وجود کوئی اہمیت نہیں رکھتا وہ جو بھی ہے سماج کے جز کے بطور اہمیت رکھتا ہے۔

یہ جذبہ کہ تم سماج کے لئے ہو یقیناً قابل قدر ہے لیکن اس قیمت پر کہ تم کچھ بھی نہیں ہو قابل قبول نہیں۔ طاقت وجبر سے ہر بات منوائی جاسکتی ہے لیکن انسان کے جذبہ آزادی اور اس کے حب نفس کو مٹایا نہیں جاسکتا۔تعلیم وتربیت کے ذریعہ اس میں سلیقہ وسعت،ٹھہراؤ اور جامعیت تو پیدا کی جاسکتی ہے لیکن اس کو فنا نہیں کیا جاسکتا۔ یہ معاشی نظام کی شدت پسندی اور انتہاپسندی کا دوسرا رخ ہے۔

سرمایہ داری نے آزادی کی حمایت میں انسان کے اس فطری جذبہ کا احترام کیا لیکن معاشرہ کو اتنا آزاد کردیا کہ فرد کی خودغرضیوں پر کوئی قابو نہ رہا اور نتیجہ میں استعداد، رجحانات اور صلاحیتوں کی فطری تفریق نے معاشرہ کو طبقات میں تقسیم کردیا اور استحصال کا بازار گرم ہوگیا۔ اس کے جواب میں اشتراکی نظام نے انفرادی آزادی کو مطلق قابل اعتبار نہ سمجھا۔ اس نے آزادی کے فطری جذبہ کو کچل دیا اور سرمایہ ودولت اور وسائل و پیداوار بھی۔ کچھ عوام تک پہونچانے کی ذمہ داری خودسرکار نے اپنے سر اوڑھ لی اور نتیجہ میں مٹھی بھر سرمایہ دار عوام کی قیمت کا فیصلہ کرنے لگے۔ مساوات کی آڑ میں انفرادی آزادی کو سلب کرلیا گیا جس کو معاشرہ بہت دنوں تک برداشت نہ کرسکا۔ تاریخ شاہد ہے کہ آزادی جیسے فطری جذبات کو جب بھی کھلی چھوٹ ملی ہے یا اس کو بیجا طور پر دبانے وکچلنے کی کوشش کی گئی تو وہ اختشار بدامنی اور بکھراؤ کا

ذریعہ بنی ہے۔ آج کے سرمایہ دار مغربی ممالک میں پائی جانے والی اخلاقی بے راہ روی، وذہنی انتشار، انسانی رشتوں کی پامالی اور ان کا بکھراؤ اور روس کے اشتراکی نظام کی موت اس بات کا واضح ثبوت ہیں۔ سرمایہ دارانہ معاشرہ میں جہاں انسان بظاہر اپنے آپ کو آزاد، خودمختار اور کھلی فضا میں سانس لیتا نظر آتا ہے اگر حقیقت کی گہرائیوں میں اتر کر دیکھا جائے تو وہ اسی قدر سکڑتا اور اپنی ذات میں مقید ہوتا نظر آتا ہے۔ اشتراکیت نے مساوات کی آڑ میں انسان کی شناخت کو ہی محصور کرلیا۔ دونوں ہی نظاموں نے انسان کو مستقل قید دی۔

دنیا کے ان دو بڑے معاشی نظاموں نے انسان کو ایک طرز زندگی تو ضرور دی لیکن انسانیت کو عروج دینے سے دونوں قاصر رہے۔ معاشی انسان آج بھی فکری کشمکش کا شکار اور ایک آدرش صالح اور عدل وانصاف پر مبنی طرز معاشرت کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ ان نظاموں کی فکروعمل نے یہ ثابت کردیا کہ وہ انسان کی بنیادی کمزوریوں خواہشات، خودغرضیوں اورفطری جذبہ آزادی کو کوئی بلندی نہ دے کر ان کو اپنے نظریات کی تبلیغ وتوسیع کا محض آلہ کار بنانے تک محدود رہے۔ اگر مروجہ نظام انسان کی ان کمزوریوں اورفطری جذبات کو اپنے نظریہ کی تبلیغ کا آلہ کار بنانے کے بجائے انسانی نفسیات کی گہرائی میں اترنے کا ذریعہ بناتے تو بہت ممکن تھا انسانیت کو بلندی مل جاتی۔

اسلام نے اپنے نظریات میں انسانی فطرت کی گہرائیوں میں اتر کر اس کی کمزوریوں کا احاطہ کیا ہے۔ انسان ہوس کا بندہ اور خواہشات کا پتلا ہے۔ وہ مفاد پرست اور خودغرض بھی ہے۔ اس کے پیش نظر محض غیردائمی مادی لذت وراحت ہے، وہ ذاتی مصلحت کو معیار بناتا ہے اور اسی کے لئے جدوجہد کرتا ہے اور یہ تمام جذبات فطری ہیں۔ نہ ان کو روکا جاسکتا ہے اور نہ آزاد چھوڑا جاسکتا ہے۔ دونوں ہی صورتوں میں معاشرہ کے انتشار کا خطرہ لاحق ہے۔ اسلام جو دین فطرت اور دین کامل ہے ان فطری جذبات سے انکار نہیں کرتا۔ ہاں ان کی شدت پسندی کا مخالف ضرور ہے۔ اس لئے وہ ایک ایسے نظام کو پیش کررہا ہے جہاں ان

جذبات کی قدر بھی ہے، آزادی بھی ہے لیکن اخلاقی اقدار اور روحانی افکار کی مکمل سرکردگی میں، ان کی سرپرستی و دیکھ ریکھ میں تاکہ شدت پسندی کو لگام دی جاسکے۔ اسلام کا معاشی انسان وہ متوازن ومعتدل معاشی انسان ہے جو اپنے اندر حب نفس کا فطری جذبہ بھی جگائے ہوئے ہے اور اخلاقی اقدار بھی جو فلاح کے لئے وضع کئے گئے ہیں۔ اسلامی معاشی معاشرے میں ملکیت، پیداوار تقسیم، قیمت سرمایہ دولت وثروت تعلیم وتربیت تلاش وجستجو انسانی رشتہ، ان کے حقوق وفرائض جیسے تمام عوامل ان عی فطری جذبات کی مناسبت آزادی اور اخلاقی اقدار کی قیود میں بندھے نظر آتے ہیں۔

ایک طرف ''حب نفس'' کی تسکین کے لئے اسلام نے انسان کو اتنی آزادی دی کہ ساری کائنات اس کے تصرف میں دے دی اور انسان نے بھی اس آزادی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اعلان کردیا:

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یارب
ہم نے دشت امکاں کو ایک نقش پا پایا
غالبؔ

انسان جب اس طرح آزاد ہوگا تو اس کی کاوشوں، جہد وجہد اور جستجو وتلاش کی سرحدیں کہاں ہوں گی اس کا اندازہ غالبؔ نے تو کرلیا لیکن شاید یورپین ذہن ابھی ان سرحدوں کو نہیں چھوسکا ہے۔ لیکن آزادی کی اس شدت کے مدنظر اسلام نے اس کو سمیٹا اور متنبہ کرتے ہوئے انسان کو آگاہ کیا کہ تو صرف خدا کے لئے ہے جو کل کائنات کا قادر مطلق ہے اور تیری ہر حرکت، ہر جذبہ، ہر نیت سے واقف ہے۔ کیا سرمایہ داری نے کبھی ایسی آزادی کا تصور کیا ہے؟

اسلام کی نظر میں اگر انسان ہوس وخواہشات کا پتلا ہے اور فطرتاً آزاد ہے تو صاحب عقل وفہم بھی ہے، اس کے پاس جذبات وخیالات کو عقل وفہم کی کسوٹی پر پرکھنے کی طاقت

بھی ہے اور فیصلہ لینے کی جسارت بھی ہے۔ اسی عقل وفہم کو اسلام نے معاشرہ کی بنیاد قرار دیا ہے۔ اسلام تسلیم کرتا ہے کہ معاشرہ ذہنی سوجھ بوجھ، جذبات احساسات، ذہنی سطحوں اور جسمانی طاقت کے اعتبار سے مختلف سطحوں میں تقسیم ہے۔ ان میں بکھراؤ، تضاد ٹکراؤ کا پایا جانا لازمی اور فطری ہے جس کا پورا فائدہ دنیاوی نظاموں نے اٹھایا، اسلام ایک مضبوط، مستحکم اور آفاقی نظام حیات کے لئے اس بکھراؤ، ٹکراؤ اور تضاد کو سب سے پہلے ختم کر رہا ہے۔

وہ پوری عالم انسانیت کو ایک لڑی میں پروتے ہوئے ایسے بلند ترین نقطہ کی طرف سمیٹنے کی کوشش کر رہا ہے جس کے پرے انسانی عقل وفہم بے معنی ہو جاتی ہے۔ اسلام کا یہ بلند ترین نقطہ ''توحید'' ہے جو عالم بشریت کی بکھری ومتضاد فکر کو متحد کرنے کا مستحکم وموثر ذریعہ ہے۔ اگر ہر انسان میں یہ بات راسخ ہو جائے کہ اس کائنات کا خالق ایک ہے، سب اس ایک خالق کے بندے ہیں، وہی ہم سب کو رزق فراہم کرتا ہے، ہماری زندگی وموت اسی کے ہاتھ میں ہے، وہ ہمارے ہر ارادے، ہماری ہر نیت اور ہمارے ہر عمل سے پوری طرح واقف ہے اور اس کے بموجب وہ خالق مطلق ہم کو جزا وسزا بھی دیتا ہے تو انسانوں کے درمیان ہر طرح کی تفریق کا جذبہ مٹ جائے گا اور یہی پر اختیاط ذہنی ہمواری عدل وانصاف ومساوات پر مبنی مضبوط معاشرہ کے قیام کی بنیاد بنے گا۔ یہاں ہر انسان آزاد ہوگا لیکن پابندی کے احساس کے ساتھ۔

اسلام کا یہی وہ توازن ہے جو دو متضاد جذبات، حب نفس اور اخلاقی اقدار، آزادی اور خود غرضی کو بغیر نظر انداز وسلب کیے یا بے لگام بنائے مثبت فکر کیساتھ قائم کیے ہوئے ہے اور معاشرہ کو راہ مستقیم پر قائم رکھتا ہے۔

اسلام کی نظر میں اختیارات پر قابو پانا اصل آزادی ہے۔ اپنے طرز عمل کو، فکر ونظر کی روشنی میں معین کرنا، تاکہ خواہشات خود ایک تنبیہ، روک ونصیحت بن جائے، آزادی کے صحیح مفہوم کا مظہر ہے۔ اسلام کی نظر میں یہ بات باعث شرف نہیں کہ انسان کی عقل پر خواہشات

مسلط رہیں کیونکہ عقل اور خواہشات کا توازن جب تک قائم ہے اس وقت تک انسان حیوان سے الگ نظر آئے گا۔ جہاں خواہشات نے عقل پر غلبہ پالیا وہ انسانیت کے دائرہ سے خارج اور حیوانیت کے دائرہ میں داخل ہوجائے گا۔ اسلام آگاہ کرتا ہے کہ اگر عقل کو مشعل راہ بناؤ گے تو انسانیت کو بیدار کرو گے اور اگر خواہشات عقل پر غالب آگئیں تو حیوانیت کو ہوا دو گے۔ آج کا معاشی انسان خواہشات کے ساتھ بہہ کر حیوانیت کے قریب ہوتا جارہا ہے۔

اسلام نے معاشرہ کی تربیت میں یہ بات ذہنوں میں بٹھادی کہ خواہشات کے ساتھ بہہ جانے میں نہیں بلکہ اعلیٰ قدروں کے لئے سعی وکوشش اور بلند مقصد کے لئے جدوجہد میں بلندی ووقار اور شرف ہے۔ یہی پاکیزگی نفس اصل آزادی کی بنیاد ہے جہاں تہذیب ومعاشرت کا آغاز بندگی، ایمان اور یقین سے ہوتا ہے اور نتیجہ میں انسان جملہ پابندیوں سے آزاد ہوجاتا ہے۔ یہاں ایک دولت مند کے دولت سمیٹنے کی ہوس اس مقام پر ٹھہر جائے گی جہاں اس کو یہ یقین ہوجائے کہ ہم نہ تو اس سے پورا استفادہ کرسکتے ہیں اور نہ مرنے کے بعد لے جاسکتے ہیں۔ ذہنوں سے تمام تفریق مٹ جائے گی۔ جب انسان کو یہ یقین ہوجائے کہ خلقت وانجام کے اعتبار ہر انسان ایک ہے خواہ وہ شاہ ہو یا گدا۔ یہ اگر دولت مند کے لئے تنبیہ ہے تو غریب کے لئے تسلی بھی ہے۔ اسلام نے انسان کو آگاہ کیا کہ مال یقیناً تمہارا ہے لیکن تم اللہ کے بندے ہو اس لیے اپنے مال کو اس وقت تک اپنا نہ سمجھو جب تک تمہاری طرح باقی بنی نوع انسان خواہ وہ کتنے ہی غریب ونادار کیوں نہ ہوں جو اللہ کے بندے ہیں ان میں ایک بھی نادار وبھوکا باقی ہے۔

انسان میں ملکیت کا تصور اور اس کا احساس فطری ہے۔ یہ تصور اس وجہ سے ابھرتا ہے کہ انسانی محنت وعمل پیداوار کا باعث بنتی ہے اور یہی پیداوار انسانی خواہشات کی تسکین کا ذریعہ ہے۔ اس لئے ہر شخص کا یہ فطری رجحان ہے کہ جس طرح وہ اپنی محنت ومشقت کو ذاتی ملکیت تصور کرتا ہے اسی طرح اس کے ثمرات کو بھی اپنی ملکیت سمجھے اور اس

سے استفادہ کرنے کا حق رکھے۔لیکن چونکہ سب کی صلاحتیں مساوی نہیں ہوتیں اور سماج کے کچھ افراد عاجز ومحتاج بھی ہوتے ہیں اس لئے اجتماعی نظام کی رو سے ذاتی ملکیت کے تصرفات کو حدود وقیود کے اندر رکھتا ہے تاکہ عدل وانصاف کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹنے پائے۔

اسلام نے بتایا کہ چونکہ انسان کی انفرادی ملکیت اس کے عمل ومحنت کا نتیجہ ہوتی ہے اس لئے ذاتی ملکیت کو عمل ومحنت کے دائرے تک محدود رہنا چاہئے جہاں انسانی محنت کی رسائی نہ ہو وہاں اس کی ذاتی ملکیت کا سوال ہی نہیں اٹھتا۔ زمین اور اس کی قوت نمو، زرخیزی، زمین میں دفن معدنیاتی خزانے، گیس پٹرول، جنگلات اور ان کی دولت پانی، سورج کی حرارت، سمندر اور سمندری دولتیں پیدا کرنے میں انسانی عمل کا کوئی دخل نہیں اس کا عمل تلاش وجستجو تک محدود ہے، وہ پیدا نہیں کرتا اس لئے مالک بھی نہیں ہے۔اگر انسان یہ دعوہ کرتا ہے کہ اگر ہماری کاوش جستجو وتلاش نہ ہوتی تو ان سب کا وجود ہی معدوم رہتا اور ہم کو ان کی افادیت کا پتہ نہ چلتا یہ ہماری محنت ہے جو ان کو عدم سے وجود میں لاتی ہے اور انسانی خدمت کے لائق بناتی ہے۔ اس لئے ان کے وجود کی اہمیت تو انسانی محنت وکاوش کی مرہون منت ہے۔اس طرح اس دولت کی قیمت کا خالق تو انسان ہوا، کسی اور کو حصہ دار بنانے کا کیا سوال پیدا ہوتا ہے۔ اس مقام پہ اسلام نے انسانی عقل کو جھنجوڑا ہے۔ اس نے سوال کیا کہ بتاؤ اس دماغ وذہن کا موجب کون ہے جس کی بدولت تمہاری تمام تر تحقیقات وتربیت عمل میں آتی ہیں اور جس کے استعمال سے قدرت کی پوشیدہ نعمتوں کا اظہار ہوتا رہتا ہے۔"کسی شے کا وسیلہ بننا خالق بننا نہیں ہوتا۔خالق وہ ہوتا ہے جو تخلیق کرتا ہے۔انسان کی محنت تو خلق کی ہوئی شے پہ محنت کرتی ہے۔خالق کی تخلیق کی ہوئی شے سے اگر تم محض اپنی محنت وکاوش کی بدولت استفادہ کرتے ہو اور پھر حق ملکیت جتاتے ہو تو خالق حقیقی کے حق کو کیوں بھول جاتے ہو۔اس لیے جب تک مالک حقیقی کے حق کو واجب نہیں سمجھا جاتا ہے اس وقت تک معاشرہ میں نہ تو منصفانہ نظام کا نفاذ ممکن ہے اور نہ مساوات وتوازن کا۔یہی وہ حق ہے جو سماج کے نادار،

غریب، محتاج، کمزور کی کفالت کا ذریعہ بن کر معاشرہ میں توازن قائم رکھتا ہے۔

اسلام نے جس طرح صارفین تک پیداوار پہنچانے کا ایک صالح نظام تقسیم مرتب کیا اسی طرح مال کو خرچ کرنے کے اصول، حدود وقیود بھی مقرر کیے۔ اسلام نے اسراف کو حرام قرار دیا ہے کیونکہ اس سے متوازن نظام تقسیم بگڑتا ہے۔ اسلام اسراف وفضول خرچی کو روک کر زائد اموال کو راہ خدا میں خرچ کرنے کی ہدایت کرتا ہے تاکہ اضافہ غریب ونادار طبقہ تک پہونچے اور اجتماعی کفالت کا موثر ذریعہ بنے۔ لیکن اس مقام پر بھی اسلام اعتدال کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتا۔ کہا گیا "راہ خدا میں خرچ کرو لیکن اپنے نفس کو ہلاکت میں نہ ڈالو" یا "اپنے ہاتھوں کو گردن سے باندھ بھی نہ دو اور بالکل کھول بھی نہ دو کہ آخرت میں خالی ہاتھ بیٹھنا پڑے۔"

اسلام وہ دین فطرت دین کامل ہے جو قانون قدرت سے بندھے آفاقی قوانین، عقلی دلائل، ٹھوس عقائد اور مخصوص تصورات کی بدولت امتیازی خصوصیات کا حامل ہے۔ وہ انسان کے لئے معتدل، متوازن نظام حیات پیش کرتا ہے جو بنی نوع انسان کی پر وقار وبلند معیار زندگی کی ضامن ہے۔ اسلام حیات انسانی کی جامع تصویر پیش کرتا ہے جس کے دو اہم پہلو واقعیت اور اخلاقیت ہیں۔ اسلام کا معاشی انسان انہیں دو خصوصیات کا مرکب ہے۔ واقعیت سے مراد ایسے مقاصد حاصل کرنا جو فطرت وضمیر کے عین مطابق ہوں۔ یعنی جہاں زندگی نہ اتنی کھلی اور آزاد ہو کہ بے راہ روی کی ڈگر پر بے لگام بڑھے اور نہ احکاموں کی زنجیروں میں جکڑی بندھی غیر معمولی گھٹن میں مبتلا ہو۔ اخلاقی اعتبار سے طریق کار یہ اپنایا کہ چاہے پیداوار، تقسیم، ملکیت، قیمت یا دیگر زندگی کے مادی عوامل جو بھی خواہشات کی تسکین کے ذرائع ہوں ان کے استعمال میں اخلاق کا دامن نہ چھوٹنے پائے۔ یعنی اسلام انسان کو خالص معاشی بشر نہیں بلکہ اخلاقی بشر بھی بنانا چاہتا ہے۔ آج دنیا کے تمام ترقی یافتہ ممالک اقتصادیات کے اخلاقی پہلوؤں پر جس سنجیدگی سے غور کر رہے ہیں وہ شاید خالص معاشی انسان

بنا دینے کے منفی نتائج کا ہی رد عمل ہے جس کو اسلام نے ابتدا سے ہی اہمیت دی ہے۔

حوالے:

۱۔علامہ سید محمد باقر الصدر طاب ثراہ: اسلام اقتصادیات اور جدید اقتصادی مکاتب

مترجم: علامہ سید ذیشان حیدر جوادی

۲۔علامہ سید محمد باقر الصدر طاب ثراہ: آج کا انسان اور اجتماعی مشکلات

مترجم: علامہ سید ذیشان حیدر جوادی

۳۔علامہ سید محمد باقر الصدر طاب ثراہ: اسلامی اقتصادیات کا جائزہ

مترجم: علامہ سید ذیشان حیدر جوادی

۴۔سید محمد حسن بہشتی طاب ثراہ سرمایہ کا حقیقی کردار'' توحید جلد ۲ مارچ اپریل ۱۹۹۴ء

۵۔شہید مرتضیٰ مطہری طاب ثراہ عقل ودل'' توحید جلد ۲ نومبر، دسمبر ۱۹۹۴

۶۔محمد رضا حکیمی دانش مسلمین (قسط ۲) توحید جلد ۲ نومبر، دسمبر ۱۹۹۴ء

۷۔فخر الدین حجازی اسلام کے امتیازات (قسط ۲) توحید ۲ نومبر، دسمبر ۱۹۹۴ء

8. BEHESHT & BAHONAR, PHILOSPHY OF ISLAM ANSARIYAN PUBLICATIONS,ISLAMIC REPUBLIC OF IRAN JULY.1990

9.Dr.YOOSUF ALQARADAWI,ISLAMIC AWACKENING BETWEEN REJECTION AND EXTREMISM NEW DELHI-1992

10.CONFERENCE ON ISLAMIC ECONOMICS-SELECTED PAPERS AMAR PARKASHAN,DELHI-1986

❀❀❀